رئیس احمد جعفری

واجد علی شاہ اختر کی شاعری

واجد علی شاہ اختر متنوع خصوصیات کے حامل تھے، وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے، جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے، غزل بھی، مثنوی بھی، مخمس بھی، مسدس بھی، رباعی بھی، سلام اور مرثیہ بھی، اور ہر رنگ میں ان کی انفرادیت قائم ہے۔ زبان پر انہیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ خیالات پر باندھے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر بول سند تھا۔ بدیہہ گوئی ان کی خصوصیت تھی۔ ان کی شاعری میں وہ رفعت اور سوز و گداز نہیں ہے، جو زمانہ کے ستائے، دکھوں کے مارے، پریشان حال اور آشفتہ روزگار، ناکام و نامراد شاعروں کی خصوصیت ہے۔ ان کی زندگی یکسر عیش و نشاط تھی ان کی شاعری بھی زندگی کے اسی رُخ کی ترجمان ہے۔ لیکن زبان کی صفائی اور صحت، بندش کی چستی، خیالات کی روانی، ترکیب کی تراش خراش میں وہ خود اپنی مثال تھے، اس نقطۂ نظر سے بجا طور پر ان کے کلام کو "ملک الکلام" کہا جا سکتا ہے۔

اب ہم واجد علی شاہ کی نغز گوئی اور غزل سرائی پر مختصر سی گفتگو کریں گے۔

مولانا عبدالرزاق مصنف البرامکہ اپنے مشاہدۂ مٹیا برج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میرے ایک خاص عزیز تھے جن کا میں مہمان تھا اور مٹیا برج کے اندر چھوٹے پیمانے پر گویا تمام لکھنؤ آباد تھا۔ کون سا محکمہ اور صیغہ تھا جو مٹیا برج کے اندر نہ تھا۔ جملہ آبادی ۴۰ ہزار تھی اور ایک لاکھ ماہوار پنشن میں ایک ٹکہ باقی نہ رہتا تھا۔ تفریحی سامان کے علاوہ علماء، شعراء اور مستند اور متعدد ادیب بھی موجود تھے۔ مولانا نظم طباطبائی مرحوم (پروفیسر نظام کالج) بھی شاہ کے تربیت کردہ تھے۔ واجد علی شاہ خود بھی شاعر تھے۔ لیکن بقول ہارون الرشید "بادشاہوں کے لئے شاعری سرمایۂ فخر نہیں ہے"۔ بادشاہ درجہ دوم کے شاعر تھے۔ لیکن اُن کے اشعار، محاورات کی سند میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ زبان سندی تھی۔ ہر دو کا نذار لکھنو کا تھا۔ لہٰذا جس بازار میں گذر ہوتا تھا یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہم لکھنؤ کے کسی بازار کی سیر کر رہے ہیں۔ اعلیٰ عہدہ دار اکثر سنّی تھے اور بادشاہ کی بے تعصبی کی دلیل تھی۔

۱۸۸۷ء میں شاہ کا انتقال ہو گیا اور چند ہی سال کے بعد مٹیا برج فسانہ بن کر رہ گیا:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

جس کی حالت ویرانی لکھنے سے قلم کا جگر شق ہوتا ہے۔ اب بھی سیاحوں کے لئے مٹیا برج عبرت کدہ ہے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت عہدِ واجدی کے شاعروں کی تصویریوں کھینچتے ہیں:

شاہی میں مشاعرہ نہایت شان وشوکت اور دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ لال بارہ دری میں سہ پہر کو چمن بندی گل و فوارہ کی ہوتی تھی۔ کمرے میں تمام سامانِ عیش تیار رہتا تھا۔ دریچیاں سبز، سُرخ کاشانی مخمل کی جن میں گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی ٹنکی ہوئی چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوئے، جھاڑ جھاب، کنول، فانوس شام سے روشن ہوگئے پردوں میں بنت، گوکھرو، لچکا ٹنکا ہوا۔ چاروں طرف قدِ آدم آئینہ بندی۔ مشاعرے عام نہ ہوتے تھے مشاعرے میں ہمیشہ اہلِ دربار شریک ہوتے تھے۔ اور کبھی خاص اعزائے بادشاہ مدعو ہوتے تھے۔

شام سے مرزا خورم بخت بہادر نواب یحییٰ علی خاں، مرزا عظیم الشان نواب محمد تقی علی بہادر، مرزا رفیع الشان بہادر نواب عمدہ لہ عظمت الدولہ مرزا سلیمان قدر بہادر، دارسطوت مرزا حیدر نیشاپوری تشریف فرما ہوئے۔ اپنے اپنے مراتب کے موافق دہنے بائیں، پیچھے، بیچ میں بیٹھے مسند پر بادشاہ جلوہ افروز ہیں۔

خواجہ سرا گنگا جمنی کشتیاں جن میں بھاری بھاری کچلے گوٹے کے ہار الائچیاں، چکنی ڈلیاں، عطر کے کنٹر رکھے ہوئے، مخملی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی لگا گئے۔ ملازمین اُٹھا لے گئے۔

اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ ہر ایک نے غزل پڑھی۔ اور یہ پُر لطف صحبت بارہ بجے شب تک ختم ہوگئی۔ اہلِ دربار کا مشاعرہ ہر مہینہ میں ہوا کرتا تھا۔ اور یہ صحبت بہت ہی پاکیزہ اور پُر لطف ہوتی تھی۔ گرمی کے دن میں شام سے لال بارہ دری کی چھت پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔ قناتیں کھڑی جاتی ہیں۔

پھولوں کے گلدستے منڈیروں پر رکھے جاتے ہیں۔ مکلّف فرش بچھایا جاتا ہے۔ قناتوں پر بیلے کے ہار پھیلے ہیں۔ اہلِ دربار اپنے قرینے سے مؤدب بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ مدار الدولہ علی نقی خان بہادر وزیر۔ یہ کون ہیں؟ فتح الدولہ بخش الملک مرزا محمد رضا خان برق۔ یہ کون ہیں؟ آفتاب الدولہ قلق۔ یہ کون ہیں؟ تدبیر الدولہ دبیر الملک منشی مظفر علی خان بہادر جنگ اسیر۔ یہ کون ہیں؟ مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خان ثابت جنگ قبول اس طرح تمام درباری تشریف لائے۔ اور اپنی اپنی جگہ پر فروکش ہوئے۔ اتنے حضور جان عالم برآمد ہوئے۔ تمام اراکینِ مشاعرہ سرو قد کھڑے ہوئے اور بسم اللہ کی صدا چاروں طرف سے آنے لگی۔ حضور مسندِ زرنگار پر باجاہ وجلال جلوہ افروز ہوئے۔ مشاعرہ دہنی طرف سے شروع ہوا۔ اور مختصر غزلیں پڑھی گئیں۔ علیٰ قدر مراتب ہر ایک کی تعریف ہوئی۔ سب کے بعد حضور نے اپنا کلام پڑھا اور مشاعرہ برخاست ہوا۔ روساء اور امرائے شہر کے بہت سے مشاعرے ہوتے تھے مگر حضور کبھی کسی مشاعرہ میں تشریف نہیں لے گئے۔ فتح الدولہ برق اور منشی اسیر نے بادشاہ کی اکثر غزلوں پر مصرعے لگائے ہیں جو مشہور عام ہیں۔

واجد علی شاہ اختر کی شاعری اور اس کے مختلف پہلوؤں پر خواجہ عبد الرؤف عشرت نے بڑی خوبی سے تنقید کی ہے:

حضرت قدر قدرت ابو منصور سکندر جاہ ناصر الدین قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ جانعالم علاوہ اور تمام علوم فنون کے گلشن شاعری کی بھی گلگشت کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اس میں بہت کچھ گلکاری کی ہے۔ اور نظم کے ہر صیغے میں دادِ سخن دی ہے۔

تمام ہندوستان کے مشہور شاعروں سے صحبت گرم رہتی تھی۔ خاص مصاحبین اچھے اچھے نامی شاعر تھے۔ خواجہ آفتاب الدولہ رشد علی خاں قلق عرف خواجہ اسد قلق۔ فتح الدولہ بخشی الملک میرزا محمد رضا برق۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک مظفر علی خان بہادر اسیر۔ گلشن الدولہ بہار۔

اس کے علاوہ صحبتِ مشاعرہ میں منتخب شعرا شریک ہوتے تھے۔ وہ زمانہ اُردو شاعری کے شباب کا تھا۔ زبان کے قواعد، محاورات کی پابندی، متروکات کا لحاظ، ثقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے پرہیز کا دور دورہ تھا۔ پھر ہمعصر شعراء میں شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ خواجہ وزیر۔ شیخ میتا عیش۔ کپتان مقبول الدولہ قبول۔ آغا ہمبو شرف۔ اللہ یار خاں سحاب۔ میر جان خاں یکتا۔ میر محمدی سپہر۔ میر امداد علی بحر۔ اصغر علی خاں نسیم۔ میر علی اوسط رشک۔ امیر علی خان ہلال۔ نواب حسین علی خان اثر۔ مہدی حسن خان آباد۔ میر وزیر صبا۔ میر دوست علی خلیل۔ میر کلو عرش۔ شیخ محمد جان شاد۔ شیخ امان علی خاں سحر ایسے ایسے باکمال استاد فن موجود تھے۔ شاعر تو شاعر امرا میں بھی اس فن کی طرف کمال رغبت پائی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی امیر اس فن کے اکتساب سے خالی نہ تھا۔ اور تمام شہزادگان والاتبار اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

مرزا ہزبر علی خاں ہزبر۔ کیوان قدر ہمایوں جاہ قیصر حشم ولی عہد مرزا حامد علی خان بہادر کوکب۔ نواب سید محمد خان رند۔ راجہ جواہر سنگھ جوہر۔ نواب طالب علی خان عیش۔ مہاراجہ جے گوپال سنگھ ثاقب۔ نواب عاشور علی خاں عاشور۔ غرض لکھنؤ میں شاعری کا اچھا خاصا باغ لگا ہوا تھا جس میں طرح طرح کے گل بوٹے کھلے، اور عجیب عجیب بلبل چہکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بادشاہ کی قدر دانی کے لحاظ سے خاص و عام میں یہ اسپرٹ بھری ہوئی تھی جس کو دیکھئے شاعر۔ جس کو سنئے شاعر۔ دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان مستند اور مقبول عام تھی۔ اور دہلی کا ٹوٹا ہوا مجمع بھی اسی دربار میں فروغ حاصل کر رہا تھا۔

محلات میں تمام بیگمات کو اگرچہ فیاضِ ازل سے سخن فہمی اور سخن گوئی کا حصہ ملا تھا لیکن بعض بعض بیگمیں زبان اور محاورات کے لحاظ سے نظم کی لڑیوں میں موتی پروتی تھیں۔ ان میں ملکہ مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عرف نواب خاص محل صاحبہ عالم کا نمبر سب سے اوّل تھا۔ ان کی تصنیف سے ایک دیوان بیاض عشاق اور ایک مثنوی بہت پیاری زبان میں مطبوعہ موجود ہے۔

ان کے علاوہ حضور عالیہ ملکہ دوراں اختر محل نواب رونق آرا بیگم بنت نواب علی نقی خان تاج النساء نواب معشوق محل

صاحبہ وغیرہ وغیرہ اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

شاہ اختر کا شاعری میں معجز نمائی کرنا ایک لازمی فعل تھا۔ بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لئے ہوئے تھا۔

تحسین فن کے اعتبار سے عروض میں اُردو کی کتاب جو العروض خود ان کی تصنیف کی ہوئی ہے، اور دوسری کتاب ارشاد خاقانی شاہدین عادلین ہیں۔

اصل بات یہ ہے کم سے کم علمی مذاق کے ہر شعبہ میں ایک نہ ایک تصنیف بادشاہ کی موجود ہے۔ پند و نصائح میں نصائح اختری"۔ اخلاق میں "مناظرہ بین النفس والعقل"۔ مزاح میں "دفتر غم"۔ مجربات خاص میں "مجموعۂ واجدیہ"۔ علم موسیقی میں "تاجو" "دلھن" اور "بنی"۔ مثنویات میں "سرور خاقانی"۔ "حزن اختری"۔ "دریائے تعشق"۔ "بحر الفت"۔

نامجات وشقہ جات میں "ملک اختر" خطابات میں "مثنوی بحر مختلف"۔ عروض میں "جو العروض"۔ ارشاد خاقانی "غزلیات میں چھ دیوان ضخیم اس کے علاوہ اور بہت سے مختلف فنون کی کتابیں ہیں طرز کلام زیادہ تر میر و مرزا کے طرز شاعری سے ملتا جلتا تھا۔ شاعری میں بڑے بڑے سخن فہم شاعر پکار اُٹھتے تھے: "خداوندیہ شاعری نہیں سحر ہے، اعجاز ہے"۔

فارسی ترکیبوں کے جملے ایک جدید شان سے چھلکتے تھے۔ اصناف سخن میں صرف چند قصیدے ایسی چیز ہیں۔ جن کے لکھنے کی بادشاہ کو احتیاج نہ تھی۔ آخر وہ بھی آئمہ معصومین علیہم السلام کی شان میں لکھے۔

مرثیوں میں اگرچہ نازک خیالی اور شاعرانہ تخیلات نہیں۔ لیکن احادیث کا ہو بہو ترجمہ اور سادی عبارت کچھ عجیب مزا دیتی ہے۔

زمانہ ولی عہدی سے غزل گوئی کا شوق ہوا۔ عروض و قافیے کے رسالے ازبر کئے۔ مشکل سے مشکل بحروں میں کسی کی اصلاح کے موتی پروئے۔ اور مشاعروں میں غزل پڑھی، بہت سے سخن فہم شاگرد ہوئے۔ مہتاب الدولہ رخشاں، تعیش الدولہ عیش۔ منشی مظفر علی ہنر، مرزا محمد عباس شاد، لائق الدولہ شاہد اور مشیر وغیرہ وغیرہ کو برسوں اصلاح دی۔ غزل میں جو لفظ بنایا پتھر کی لکیر ہو گیا تھا۔

جب زمام سلطنت ہاتھ میں لی، شعر و سخن کا چرچا بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر باوجود اس کے دو منشی تصنیفات کی تحریر ملازم تھے۔ عہد سلطنت کا ذکر ہے، منشی امیر اللہ تسلیم نے جو علاوہ شاعر ہونے کے خوشنویس بے بدل تھے۔ ایک عریضہ حضرت ابو المنصور کی خدمت میں نظم میں نہایت خوشخط پیش کیا۔ اتفاق وقت سے حضور کی نظر اُس عرضداشت پر پڑ گئی۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بعد ملاحظہ شرح دستخط نظم لکھوائی۔ وہ اشعار یہ ہیں:

بشنو اے خوشنویس اے خوشگو ہر دو فن مے کنی دہر دو نکو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد بست و دو روپیہ مقرر شد

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حضور اُردو نظم میں قادر الکلام تھے اُسی طرح فارسی میں بھی برجستہ فی البدیہہ کہتے تھے۔

بادشاہوں کا کلام اس سبب سے لوگ کم دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری تعریف کی بوچھاڑ کے کمال کی حد تک نہیں پہنچ پاتی اور مصاحبین کی بے جا خوشامد سے پختہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی۔ مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا۔ وہ اپنے کلام کو ہمیشہ نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کو یہ شک ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی نقص شاعری کلام میں رہ جائے۔ اور چونکہ خود سخن فہم تھے، اس سبب سے ایسے ویسے شاعر کی غزل ان کے مشاعرے میں مشکل سے مدح کی مستحق ہوتی تھی۔ دوسرے اہلِ کمال کا کثیر مجمع آپس کی چشمک سے ہر اک محک امتحان بنا ہوا تھا۔ کوئی لفظ بے محل صرف کیا اور شاعر نظر سے گر گیا۔ ایسا ویسا شاعر تو سامنے مُنہ نہیں کھول سکتا تھا۔ آتش و ناسخ کی چوٹیں، برق اور رشک کی نوک جھونک اکتسابِ فن کے واسطے کیا کم تھیں۔

ایک مرتبہ ایک شاعر نے ایک شعر مثالیہ پڑھا:

اہلِ جوہر نہیں جھکتے ہیں کسی کے آگے
ٹوٹتی ہے وہی تلوار جو فولادی ہے

حضرت نے بہت پسند فرمایا۔ اور تمام مشاعرے نے داد دی۔ دوسرے مشاعرے میں ان کے حریف نے اس کے جواب میں ایک شعر کہا جو عام پسند ہوا:

نیک و بد سب سے جُھک کے ملتے ہیں
دونوں ناکوں پہ تیغ کستی ہے!

اس طرح پر مشاعرے میں نوک جھونک اشارتاً و کنایتاً چوٹیں فی البدیہہ اشعار ہوا کرتے تھے۔ اور دادِ سخن ملتی تھی۔ لیکن جانعالم نے تو باوجود مشاغل امور سلطنت کے جو کچھ فرمایا، آویزۂ گوش خلائق ہوا۔ ہر غزل مقبول خاص و عام تھی۔ مشکل سے مشکل اور سنگلاخ زمین آپ کے دریائے فکر کے آگے پانی تھی۔ ہر پہلو ہر جزئیات بلاغت کا خیال رہتا تھا۔ پھر تشبیہات و استعارات کی ملمع کاری نورٌ علیٰ نور۔

ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے تمام کلام پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معنوی خوبیاں اور عمدہ تخیل کے سمندر موجزن نظر آئیں گے۔

جزئیات پر خیال کیجیے، تو قلیل استعمال قافئے اس شائستہ پہلو سے نظم کہتے ہیں جن سے بہتر کہنا غیر ممکن ہے:

بندے کو اس کے عشق ہے ذات و صفات کا
مبدع حقیقتاً ہے وہ کل کائنات کا

توحید

چشمِ وحدت میں وہ معشوق جو لاثانی ہے　　حلقۂ چشم بھی اک خانۂ سلطانی ہے

شاہدِ اصلی مجھے مقصود ہے　　کعبۂ دل میں وہی معبود ہے

دونوں صفحے ہیں تری وحدت پہ دال　　جب دوئی سے ان کو دیکھا فرد ہے

وہ جو معشوقِ حقیقی حسن میں موصوف ہے　　عشق میں عاشق بھی اس کا شہر میں معروف ہے

تجرد

دفترِ عالم میں بس وہ فرد ہے　　جو مجرّد اس چمن میں مرد ہے

مختلف مضامین

مئے رنگیں پہ لاکھوں کاسۂ سر چور ہوتے ہیں　　رُخِ ساقی سے یہ مینوش سب مخمور ہوتے ہیں

پردہ نشیں سمائے دلِ ناشناس میں　　آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں

اگر محراب ابرو بت کی ہے، تو آنکھ ساحر ہے　　مسلمانی بظاہر ہے، مگر باطن میں کافر ہے

کھلے گی تختۂ کاغذ پہ سرخی خونِ شاعر کی　　قلم تیغ مضامیں سے یہ سر ہو جائے حاضر ہے

زیادہ تر افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر تصانیف کا قلمی ذخیرہ جس کو سلطانِ عالم خزینہ زر و جواہر سے زیادہ عزیز دیکھتے تھے۔ زوال سلطنت کے ساتھ ساتھ سفر میں گم ہو گیا۔

مثنوی میں "سرور فاقان" ایک ایسی مثنوی ہے جس میں بادشاہ نے اپنی عاشقی کی سرگذشت لکھی ہے۔ اور واقعات کے

جو جملہ استعمال کیا جاتا ہے اسی پہلو سے نظم کیا ہے۔ مثلاً:

ترانہ گل کا جو پیک صبا نے سکھلایا　　چمن میں نغمۂ بلبل میں اڑا لایا

زندگی تخت پر کی مر کے گئے قبر میں شاہ　　فکر آغاز میں ہوتا ہے یہ انجام نصیب

رونا ہوں مرا اشک ہر قلزم کے برابر　　خاموش ہوں لیکن ہے تکلم کے برابر

نوشتۂ تقدیر

یہ عشق ترے حسن سے قسمت میں لکھا ہے　　افسوس نہیں چاہیئے ہم کو شدنی پر

نکالوں کس طرح دل سے تری مژگاں کے تیروں کو　　مٹا سکتا نہیں انسان ہاتھوں کی لکیروں کو

غم پیری

دل بھی کھلاتے ہیں جوں جوں بال ہوتے ہیں سفید　　بلبلیں بھی سرد ہوں موسم ہے پت جھڑ کا اگر

عیش دنیا بزم غم اندوز ہو　　رنج و غم توام مجھے ہر روز ہو

عشق حقیقی

کچھ نہیں اختر مجھے عشق مجازی سے حصول　　اب تو معشوق حقیقی سے ہے اپنا اختلاط

جو معشوق حقیقی ہے مجھے اس کی غلامی ہے　　وہ آقا ہے کہ سرنامہ پہ جس کا نام نامی ہے

خضوع و خشوع

ہم نمازوں میں جو بے آس کھڑے رہتے ہیں　　سامنے چشم کے وسواس کھڑے رہتے ہیں

حمد میں صفات و کائنات کے قلیل الاستعمال قافئے کس عمدہ تخیل کے ساتھ ادا کئے ہیں :

ناقوسِ برہمن سے صدائے اذان سُن
مسجد سے میں نے قصد کیا سومنات کا

توحید پرستی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا :

جا سے بیجا ہو گئے کس کا رہا مسکن بچا
عشق کی منزل سے کب میں دوست اور دشمن بچا
رشکِ پائے یار سے پامال ہیں اہلِ فرنگ
ٹھوکروں سے اس بُتِ خود کام کی ارگن بچا
رہروِ ملکِ عدم کا حال کچھ کھلتا نہیں
اے جرس اس قافلے پر ہے ترا شیون بچا

مذکورۂ بالا اشعار میں خوبیِ معانی اور شوکت کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی ہر ردیف کے جدا جدا معانی پیدا ہوتے ہیں۔ مطلع میں "بچا" کے معنی ٹھکانے کے لئے گئے ہیں یعنی "برجائے خود"، دوسرے شعر میں "بچا" نواخت کے معنی پر نظم ہوا ہے۔ تیسرے شعر میں "بچا" دوست اور صحیح کے معنی دیتا ہے :

ابرو کا کوئی مجھ پر اب وار نہ ٹھہرے گا
وہ ترک بھی عاری ہے تنہا رنہ ٹھہرے گا
کانٹا ترے تلووں کا آنکھوں سے نکالیں گے
کھٹکا ہے نگاہوں میں یہ خار نہ ٹھہرے گا

بعض بعض مقام پر رعایت لفظی کو آپ نے صرف کیا ہے۔ لیکن اس میں رعایت معنوی کا خوبصورت پہلو مستتر ہے :

ساون کی طرح ہجر میں مُنہ آنکھ سے برسا
بجلی کا بڑا وصل میں کچھ نور نظر کا
کس کی نظرِ صاف کی تاثیر ہوئی ہے
اختر کو نہ دیکھا تھا کبھی ہم نے قمر سا
ابلقِ شب کو اگر یار نے موڑا ہوتا
توسنِ عمرِ رواں پر مرا کوڑا ہوتا

خاص لکھنؤ کی زبان اور محاورات جو بادشاہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں وہ بہت معتبر اور مستند ہیں۔ جس موقع پر

لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔ مجموعہ بیگمات کے ابتدائی تعلقات اور متعہ کے قصہ طلب واقعات کو بالتصریح نظم فرمایا ہے۔

انتخابِ کلام

جنابِ اختر کے کلام کا نمونہ ذیل میں درج کرتا ہوں :

لگی ہو چوٹ جس کو عشق کی باتوں میں اچھا ہے — زباں نے خاصہ پیدا کیا ہے مومیائی کا

پابند دل ہوا جو تمہارے خیال کا! — ہر دم ہے پیشِ چشم تصوّر جمال کا
ہر عاشقِ دل سوختہ دیوانہ ہے اس کا — وہ شمع تجلّے ہے یہ پروانہ ہے اس کا

عارضِ صاف ترا رشکِ قمر دیکھ لیا — جان سی آگئی جب ایک نظر دیکھ لیا

جو شب کو کوٹھے پر وہ چاند بے نقاب آیا — چھپا ہلالِ فلک اس قدر حجاب آیا

رُخ اپنا ہم کو دکھلایا تو ہوتا — ذرا سورج کو شرمایا تو ہوتا

گالوں پر جو اُس یار کے بالا نہیں رہتا — شب کو کبھی مہتاب پر ہالا نہیں رہتا

اُلفت نے تری ہم کو تو رکھا نہ کہیں کا — دریا کا نہ جنگل کا ہوا کا نہ زمیں کا

مری زباں سے پوچھو مزا محبت کا — یہ خوب جانتی ہے ذائقہ محبت کا

دلِ گویا کو ترے عشق نے خاموش کیا — یاد غیروں کی ہوئی مجھ کو فراموش کیا

محبت کا بندہ بنا لیجئے گا — مرا دل بھی نامِ خدا لیجئے گا
ابھی امتحانِ محبت نہ کیجے! — کبھی تیغ سے آزما لیجئے گا

عجیب کوچہ ہے اپنے جی کا کہ پاؤں ٹکتا نہیں خوشی کا
پتا نہیں ان کی دل لگی کا یہ دل بھی ہے معشوق کسی کا

دنیا کی ہوس

ہوس بڑھتی ہے اتنی جس قدر یہ عمر گھٹتی ہے
ضعیفی کہہ رہی ہے کوئی کمسن ہو تو میں آؤں

گئی بہار نہ کر الفت زن و فرزند
خزاں چمن میں ہوئی موسم خضاب آیا

اندھیرا بزم میں تھا تو جوا نجمن میں نہ تھا
چمن اُداس تھا اے گل جو تو چمن میں نہ تھا

غرور کا جو کیا احتمال اختر پر
کلام کبر زباں پر نہ تھا، دہن میں نہ تھا

اختر اس بے مہر سے ناحق وفا کا دھیان ہے
تو نے یہ کیسا خیالِ خام اے ناداں کیا

مجھی کو واعظا پند و نصیحت
ذرا اس کو بھی سمجھایا تو ہوتا

کچھ لطف خوشی ہے نہ مجھے خوف الم کا
حسرت ہے نہ راحت کی نہ دھڑکا ہے ستم کا
حیراں ہوں میں ان دونوں ترجیح کسے دوں؟
ہستی کی تمنا ہے نہ کچھ خوف عدم کا

حیف ہے شہر خموشاں کا نہ کچھ حال کھلا
نہ وہ صورت نہ وہ سیرت نہ وہ اقوال کھلا

آخری کلام

اُردو کے ایک اور داستان گو واجد علی شاہ کی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

واجد علی شاہ کا کلام ہر صنف میں موجود ہے، غزل، سلام، مرثیہ، مثنوی، قصیدہ وغیرہ کے علاوہ نثر کی کتا

ہیں۔ دادرا، ٹھمری بھی کہتے تھے۔ اور خوب کہتے تھے۔ شاید ہی کوئی بادشاہ اتنی تصنیفیں چھوڑ گیا ہو۔ پورا کلام اب ملتا کہاں ہے۔ جس قدر اب بھی واجد علی شاہ کی تصانیف زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ رہ گئی ہیں، وہ بھی بہت ہے۔ بادشاہ نے ہندی الفاظ و محاورات کے مستند طور پر طریقِ استعمال میں اور زبان اُردو کی وسعت کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا۔ بادشاہ کا کلام صفائی، اثر اور درد مجموعہ ہوتا ہے۔ جب بادشاہ کلکتہ جا رہے تھے۔ تو سفر کے درمیان انہیں تکلیفیں پہونچیں۔ اس سفر میں اُنہوں نے یہ بے مثل شعر کہا تھا:

زمانہ تھا پسا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے
پر اب ہے دھوپ سر پر اور کنکر پاؤں کے نیچے

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں — لکھنو پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

آہ کرتا ہوں تو سب لوگ خفا ہوتے ہیں — اے نسیم سحری ہم تو ہوا ہوتے ہیں

یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت مگر — ختم ہے اختر بے کس پہ جفائے غربت

قید ہونے سے کہیں بوئے ریاست جائے گی
لاکھ گردش آسماں کو ہو زمیں ہوتا نہیں

اسلام اور رواداری

رئیس احمد جعفری

قرآن کریم اور حدیثِ نبوی کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ کیا حسنِ سلوک روا رکھا ہے اور انسانیت کے بنیادی حقوق ان کے لئے کس طرح اعتقاداً اور عملاً محفوظ کئے ہیں۔ حصہ اوّل ۴/۷ روپے۔ دوم ۸/۷ روپے

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ۲ کلب روڈ۔ لاہور